سلسلۂ دروس فقہ
از ڈاکٹر معروف دوالیبی، شام

کتاب و سُنّت

(۱)

کتاب اللہ

کتاب اللہ یا بالفاظ دیگر قرآنِ کریم اسلامی شریعت کا ماخذِ اساسی اور اصلِ اوّل ہے۔ یہ اس سے بالا و برتر ہے کہ انسان اسے حیطۂ تعریف میں لائے یا اپنے بیان کی حدود میں محدود کرے۔ صاحبِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب اللہ کا نزول نجماً نجماً (یعنی اجزاء اور ٹکڑوں کی صورت میں) ہوا ہے۔ نزول کی ابتداء آپؐ کی ولادت مبارک کے اکتالیسویں سال ۱۷ رمضان المبارک کی رات سے ہوئی اور انتہاء پیدائش کے ۶۳ ویں سال اور ہجرت کے دسویں سال ذوالحجہ کی ۹ تاریخ کو یعنی حج کے روز ہوئی۔ نزول کی صورت یہ تھی کہ حالات جس امر کے متقاضی ہوتے تھے یا معاشرہ کے جو داعیات و مطالبات ہوتے اُن کے مطابق کبھی ایک آیت اترتی اور کبھی یکبارگی چند آیات نازل ہو جاتیں۔ تمام قرآن مختلف سورتوں میں منقسم ہے۔ ان سورتوں کی کل تعداد ۱۱۴ ہے۔ پہلی سورت الفاتحہ ہے اور آخری الناس ہے۔ پھر ہر سورت چند آیات سے مرکب ہے، ان آیات کی مجموعی تعداد ۶ ہزار ۲ سو ۴۲ ہے۔ اس عظیم تعداد میں سے وہ آیات جن میں شرعی اور قانونی احکام بیان کیے گئے ہیں، صرف ۵ سو کی تعداد میں ہیں۔ سب سے پہلے جن آیات کا نزول ہوا ہے۔ وہ سورۂ علق (پارہ ۳۰) کی مذکورۂ ذیل ابتدائی آیات ہیں:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔	اپنے ربّ کے نام سے پڑھ، جس نے کائنات کو پیدا کیا (خاص طور پر) انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھ، تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے علم سکھایا اور انسان کو ان چیزوں کا علم دیا جن وہ بے خبر تھا

سب سے آخر میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد حجۃ الوداع کے روز نازل ہوا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ، وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ، وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ۔ پ ۶)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا۔

قرآن کی دعوت اور اس کے اصول | قرآن جس دعوت کو لے کر اٹھا ہے، اس کے دو بنیادی مقاصد ہیں، اولاً تمام غیر عقلی اور جاہلی رسوم و عادات کی بیخ کنی۔ ثانیاً معاشرۂ انسانی کی کامل اور جامع اصلاح، جو مذہبی عقائد و نظریات سے لے کر اجتماعی تعلقات تک محیط ہے۔ ان دونوں برتر مقاصد کی تکمیل و اتمام کے لیے قرآن نے اپنی مساعیٔ دعوت کو چار شعبوں پر مرتکز کیا ہے، اور کہیں ان میں یکسر تبدیلی اور اساسی انقلاب سے کام لیا ہے اور کہیں ان میں محض اصلاح و تطہیر پر اکتفا کیا ہے۔ وہ چار شعبے یہ ہیں: (۱) عقائد و افکار (۲) مذہبی مراسم (۳) اخلاق (۴) حقوق (اپنی جملہ انواع و اقسام سمیت)

لیکن قرآن کی ہر گونہ اصلاح و تہذیب اور انقلاب و تغیر کی مساعی میں خواہ وہ عقائد و اخلاق سے متعلق ہوں یا حقوق و اخلاق سے، ایک ہی روح جاری و ساری ہے اور ایک ہی پاکیزہ و برتر تصور کارفرما ہے یہ روح اور تصور ذیل کے پانچ مبادی کا مجموعہ ہے:۔

۱۔ دعوت الی الحیاۃ،

۲۔ دعوت الی الخیر

۳۔ امر بالمعروف

۴۔ نہی عن المنکر

۵۔ مذکورہ امور کے قیام میں عقل و خرد اور تفقہ و تدبر کے رشتہ کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا۔

قرآنِ کریم نے ان مبادیٔ خمسہ کو روبعمل لانے کے لیے اور اپنے تمام اہداف و مقاصد میں ان کی رعایت کو ملحوظ رکھنے کے لیے متعدد طریقے اور گوناگوں اسالیب بیان اختیار کیے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اس دعوت پر ایمان لائے اور اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دیا۔ قرآن نے ان کے اندر متعدد طریقوں سے نیکی کی دعوت

کی محبت اور تڑپ اس درجہ پھونکی کہ وہ اُن کا شب و روز کا وظیفہ ہوگئی، امر بالمعروف کا ولولہ اس پیمانے پر نشوونما دیا کہ اس میدان میں اُن کے شغف و انہماک کے قصے سُن کر عقل ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتی ہے۔ منکر کے خلاف ان کے جذبات کی شعلہ فشانی اس انتہا تک پہنچا دی کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن نے ان کے اندر یہ حزم و احتیاط بھی بیدار کیے رکھا کہ وہ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تمام سرگرمیوں میں اور تمام جذبات و میلانات میں قاضیٔ عقل و علم کے زیرنگیں رہیں۔ چنانچہ اس اعتدال پسندانہ روش نے ان کی کایا پلٹ کر رکھ دی اور انہیں خیرالامم کے منصب پر متمکن کیا۔

مبدأ اول یعنی دعوت الی الحیات کا ماخذ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ۔

اے ایمان والو اللہ کا اور رسول کا حکم مانو جس وقت وہ تمہیں اُس کام کی طرف بلائے جس میں تمہاری زندگی ہے۔

مبدأ دوم، سوم اور چہارم کے موضوع پر قرآن کی متعدد آیات موجود ہیں، لیکن سب سے جامع آیت یہ ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔

مبدأ پنجم کے متعلق بھی قرآن کی جا بجا توضیحات و ہدایات ملتی ہیں، مثلاً:

(۱) قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي۔

اے نبی ان سے صاف کہدو کہ میرا راستہ تو یہ ہے۔ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں خود بھی پوری بصیرت اور روشنی کے ساتھ اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

(۲) كَذَٰلِكَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

(۳) كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔

اسی طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔

(۴) فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

اہل ذکر (علماء اہل کتاب) سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے ہو۔

(۵) قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

اے نبی آپ کہدیں کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں وہ ان لوگوں کے برابر ہو سکتے ہیں جو علم نہیں رکھتے ہیں۔

(۶) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاءَنَا۔ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ

ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟۔

دین کے مغربی تصور اور قرآنی تصور کا فرق اوپر کی چند آیات سے ہمارے سامنے دو پہلو واضح ہوتے ہیں۔ ایک تو ان میں اس روح اور مرکزی تصور کا مجمل خاکہ ملتا ہے جو قرآن کے تمام اہداف ومقاصد میں جاری وساری ہے اور دوسری طرف یہ آیات دین کے اصل مفہوم پر روشنی ڈالتی ہیں جو دورِ حاضر کے مروجہ مفہوماتِ دین سے کلیتہً جداگانہ اور مختلف نظر آتا ہے۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دوسرے مباحث میں داخل ہونے سے قبل ثانی الذکر پہلو پر کچھ گفتگو کریں۔

مغربی مفکرین نے دین کی متعدد تعریفیں بیان کی ہیں۔ فرانسیسی "انسائیکلو پیڈیا آف علوم وآداب وثقافت" میں ریلجن آرٹیکل میں اس کی جو تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے:

"دین کے بارے میں جس قدر تعریفات کی گئی ہیں ان سب میں عمدہ ترین تعریف گوبلٹ ڈلویلا (GOBLET D'ALVIELLA) کی ہے، وہ لکھتا ہے: دین اُس طریقے کا نام ہے جس کے ذریعہ

انسان عالم بالا کی غیبی قوتوں کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرتا ہے"

انسائیکلوپیڈیا میں دین کی ایک اور تعریف بھی نقل کی گئی ہے:

"جیمس ڈرمسٹیٹر (JAMES DERMESTETER) کے نزدیک دین کی تعریف یہ ہے: دین ان معلومات و محسوسات اور ان اختیارات کا مجموعہ ہوتا ہے جن کا علم و عقل سے کوئی تعلق نہیں"

لیکن جب ہم قرآن کی مذکورہ بالا چند آیات اور اسی موضوع کی دوسری لاتعداد آیات کی روشنی میں قرآن کے تصورِ دین کا مطالعہ کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام، جسے قرآن نے اپنا دین ٹھہرایا ہے،[1] ان تمام تصورات و مفہومات سے مختلف ہے جو علمائے مغرب سے منقول ہیں اور جو موجودہ زمانے کے اکثر اذہان و عقول پر چھائے ہوئے ہیں۔ اسلام جن مقاصد و اہداف کا علمبردار ہے، ان کا دائرۂ اثر اپنی وسعت و ہمہ گیری کے لحاظ سے ان تمام تنگ و کج اور غیر عقلی حدود سے متجاوز ہے جنہیں مغربی مفکرین نے مفہومِ دین کے ارد گرد قائم کر رکھا ہے یا پہلے سے ان حدود کو متعین کر کے دین کو ان میں محصور کر دیا ہے۔

قرآن کے بیان کردہ مفہوم کی رو سے دین نہ تو "عالم بالا کی غیبی قوتوں کے ساتھ تعلقات" کی چار دیواری میں محدود ہے اور نہ علم و عقل سے بے تعلق ہے۔ بلکہ وہ آفاقی و کائناتی دین ہے۔ وہ عالم بالا کی غیبی قوتوں کے ساتھ بھی انسان کا رشتہ استوار کرتا ہے اور "انسان کے ساتھ انسان کے تعلقات" بھی قائم و مستحکم کرتا ہے اور مزید برآں وہ اپنے ماننے والوں کو بار بار ہدایت اور تاکید کرتا ہے کہ وہ ان تعلقات کے قائم کرنے اور ان رشتوں کو مستحکم کرنے میں عقل و تدبر اور فکر و بصیرت سے کام لیں۔ اس طرح سے قرآن دینِ اسلام کو ایک مکمل نظریۂ زندگی اور ضابطۂ حیات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ نہ کہ مذہب کے اس تنگ مفہوم کے لباس میں جو مغرب میں پایا جاتا ہے یا جسے وہ تمام لوگ اختیار کیے ہوئے ہیں جو مذہب کو محض خدا اور بندے کا پرائیویٹ معاملہ سمجھتے ہیں۔

قرآن کے دینی مفہوم اور رائج الوقت مفہوماتِ دین کے مابین جو اساسی اور مرکزی فرق پایا جاتا ہے

---

[1] جیسا کہ ذیل کی آیت میں آتا ہے، جو سنہ ۱۰ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا — آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے

اس کی طرف آغازِ بحث ہی میں توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہیں اس لیے محسوس ہوئی ہے تاکہ اسلامی قانون کا طالب علم پہلے ہی قدم پر تصورِ دین کے بارے میں اس عظیم غلطی سے آگاہ ہو جائے جس میں مغربی اہلِ فکر کی بہت بڑی تعداد گرفتار ہے اور وہ اسی غلط تصوّر کی وجہ سے اسلام کے نظامِ قانون کو بھی "مذہبی قوانین" کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور بلا تامل اس پر جمود، تغیر ناپذیری اور انسانی مصالح سے بے آہنگ ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے۔ مغربی مفکرین کے اس مغالطے کی ترجمانی پروفیسر سینٹیلانا (SANTILLANA) کے یہ الفاظ کرتے ہیں:

"یہ خیال بکثرت پھیلا ہوا ہے کہ مغرب کے قوانین اور مذاہبِ اسلام کے مابین موافقت کی سعی عبث اور لاحاصل ہے، کیونکہ اسلامی احکام و قوانین مغرب کے اصول و قواعد سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مغرب کے نظریات میں اور اسلامی قانون میں منافقت و معادات پائی جاتی ہے مزید برآں اسلامی قانون میں ارتقاء و تغیر پذیری کی صلاحیت مفقود ہے۔ اہلِ مغرب کے اس مزعومہ کی بنیاد یہ ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی قانون خاص مزاج اور فطرت کا حامل ہے یعنی وہ "مذہبی قانون" ہے۔

پروفیسر سینٹیلانا نے یورپ کی اس فاش غلطی کو محسوس کیا ہے اور اس کا پورا جائزہ لے کر اس کا رد کیا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کے مقاصد و مبادی کے باب میں ابھی ابھی ہم نے جو آیات نقل کی ہیں اسلامی شریعت کے بارے میں مغرب کی غلط فہمی اور کج فکری کا رد کرنے کے لیے صرف وہی کافی ہیں۔ قرآن نے امت کو تدبّر و تفکّر کی جو دعوت دی ہے اُسی کا نتیجہ ہے کہ اسلامی قانون میں اور اسلامی اصولِ فقہ میں تفقّہ، تعقّل اور قیاس و رائے ــــ جو اجتہاد کے مختلف نام ہیں ــــ کو باقاعدہ قانون کا ماخذ و منبع ہونے کی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ اور اسلامی قانون کی یہی وہ بنیاد ہے جس نے ماضی کے ہر دور میں اُسے معاشرہ کی مصلحتوں اور وقتی تقاضوں کا ہم آہنگ و حاجت روا بنائے رکھا ہے اور اسی کی بدولت اب بھی اس میں وسعت پذیری اور ارتقاء و عروج کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

قرآن کا طرزِ بیان | مطالب و معانی کے بیان میں قرآن ایک مخصوص طرز اور اسلوب کا حامل ہے۔ اس کے مخصوص طرز و اسلوب سے آگاہ ہوئے بغیر جو شخص قرآن کا مطالعہ کرے گا۔ وہ قدم قدم پر آیاتِ قرآنی کے سمجھنے میں ٹھوکر کھائے گا اور آیات کے باہمی ربط و نظم کا سررشتہ ہاتھ نہ آنے کی وجہ سے وہ بین السطور

بھٹکتا رہے گا۔

آغازِ کلام میں آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کا مقصدِ اساسی معاشرۂ انسانی کی کامل و شامل اصلاح ہے جو انسان کے عقائد و اعمال اور حقوق و اخلاق کے تمام گوشوں کو محیط ہے، یہ معلوم کر لینے کے بعد ہم منطقی طور پر اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ قرآن کا اسلوب بیان اور طرزِ تعبیر بہرحال اس نوعیت کا نہیں ہو گا جو عام طور پر ہم کسی خاص فن یا کسی مخصوص موضوع کی علمی کتاب میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوعِ بحث صرف عقائد نہیں ہیں کہ کتبِ عقائد کے طرز پر وہ بس اعتقادی مسائل کی تشریح و توضیح تک محدود رہے۔ نہ ہی قرآن کا مدعا محض شرعی احکام کی تعلیم و تفہیم ہے کہ اُس نے اپنے مباحث کا تانا بانا اُس نہج پر بُنا ہو جو ہم شرعی احکام و مسائل کی کتابوں میں دیکھتے ہیں، اسی طرح قرآن کا موضوعِ گفتگو فقط علمِ اخلاق یا فقط علمِ قانون تک بھی محصور نہیں ہے جس کی بنا پر ہم یہ خیال کریں کہ اس کا تحلیل و تجزیہ کا ڈھنگ بھی اُسی انداز کا پابند ہو گا جو علمِ اخلاق اور علمِ قانون کی مؤلفات کے لیے مخصوص و معروف ہے۔ اس کے برعکس قرآن چونکہ معاشرۂ انسانی کی کامل و ہمہ گیر اصلاح کا علمبردار ہے، اس لیے اُس کا روئے سخن پورے انسانی معاشرہ کی جانب ہے اور وہ ان تمام اصول و مبادی کو زیرِ بحث لاتا ہے جن کا تعلق معاشرے کے کسی نہ کسی گوشے سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری یہ سعی لاحاصل اور فضول ہو گی، اگر ہم قرآن کی آیات میں اس طرح کا تصنیفی اور کتابی اسلوب اور اس طرز کا ربط و نظم تلاش کریں جو اس شکل میں ہو سکتا تھا جبکہ یہ صرف عقائد کی کتاب ہوتی یا اس میں محض شریعت کے احکام و مسائل کا بیان ہوتا یا یہ اخلاقیات یا قانونیات کا کوئی مجموعہ ہوتا۔ بلکہ اس خیال سے ہٹ کر ہمیں آیات کا ربط و تعلق دریافت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سورتوں کے افتتاحی کلمات پر غور کریں۔ قرآن جب کسی سورت کا افتتاح کرتا ہے تو آغازِ کلام ہی میں وہ کسی اصولی حقیقت یا چند اصولی حقائق کا ذکر کر دیتا ہے جو دراصل آئندہ سورت میں زیرِ بحث آنے والے موضوع پر فکری اور نظری رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں۔ ربطِ آیات کا رشتہ ہمیں انہی اصولوں کی روشنی میں دستیاب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن جب سورت کا آغاز کرتا ہے اور مطلعِ سورت میں وہ کسی اصول کو بیان کرتا ہے یا کسی نظریے کا اظہار کرتا ہے تو پھر وہ متصلاً بعد کی آیات میں اسی کی تشریح اور توضیح کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس اصول یا نظریے سے

متعلق جو اعتقادی مسائل، شرعی احکام و واجبات، اخلاقی ہدایات اور قانونی مسائل ہو سکتے ہیں ان سب پر کلام کرتا چلا جاتا ہے۔ ان تمام مباحث کا سررشتہ دراصل اُسی نظری حقیقت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے جو آغاز ہی میں پیش کی جا چکی ہوتی ہے۔ یہ ہے قرآن کا مخصوص اسلوب بیان۔ اسی اسلوب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مستشرقین کا گروہِ کثیر اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ قرآن بے ربط اور بے جوڑ آیات کا مجموعہ ہے۔

آیاتِ احکام کا مجموعی مزاج | قرآن شرعی قوانین اور احکام کا ماخذِ اول اور مصدرِ اساسی ہے۔ اس کے علاوہ جتنے ماخذ اور اصول ہیں وہ درحقیقت اسی سرچشمہ کی شاخیں اور فروع ہیں، اسی پر وہ قائم و مبنی ہیں اور ان کی حقیقت و رُوح اسی ماخذ سے ماخوذ و مستفاد ہے[1]۔ اسی وجہ سے قرآن میں جس قدر احکام وارد ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر اصولِ عامہ اور قواعدِ کلیہ کی صورت میں ہیں جن کی قضا اور قیامِ عدل میں ضرورت پڑتی ہے یا جو اجتہاد و استنباط کے سلسلے میں رہنمائی اور روشنی فراہم کرتے ہیں[2]۔ آیاتِ احکام کا یہی وہ اصولی مزاج اور عمومی فطرت ہے جس کی وجہ سے اکثر آیات و احکام میں رسول کی تشریح اور بیان کی ضرورت لاحق ہوتی ہے چنانچہ خود ذاتِ باری تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منصب کو بیان کیا ہے:

۱۔ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۔

اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہِ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

۲۔ وَاَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ ۔

اور ہم نے تمہاری طرف ذکر بھیجا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے۔

چنانچہ سنت قرآن کے اختصار کی تشریح، اجمال کی تفصیل اور اشکال کی تبیین کرتی ہے۔ یہی وہ ضرورت[3] و اہمیت ہے جس نے کتاب اللہ کے پہلو بہ پہلو سنت کو ماخذِ تشریع کا درجہ دیا ہے۔

[1] ملاحظہ ہو الموافقات از شاطبی، جزء ثالث ص ۳۶۰ مطبعہ رحمانیہ، مصر۔ [2] ایضاً ص ۳۶۶ - ۳۶۸

تشریع کے باب میں قرآن کن مآخذ کو قبول کرتا ہے؟ احکامِ شریعت اور حقوقِ اسلامی کے باب میں قرآن نے درجۂ اول پر جس ماخذ و مصدر کو تسلیم کیا ہے وہ آیاتِ الٰہی ہیں۔ دوسرے درجہ پر وہ سنتِ رسول کو ماخذ شمار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا — رسول جو کچھ تمہیں بتائے اُسے اختیار کرلو اور جس چیز سے منع کرے اُس سے رُک جاؤ۔

سنت کو ماخذِ ثانی قرار دینے کے بعد ضمناً ان تمام مآخذ کو درجۂ اعتبار میں رکھتا ہے جنہیں سنت ماخذ تسلیم کرتی ہے مثلاً اجماع اور اجتہاد وغیرہ۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اجتہاد و قیاس کا ماخذِ شرعی ہونا براہِ راست قرآن سے ثابت ہے۔ ان کا استدلال قرآن کی اس آیت پر مبنی ہے:

لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ۔ — اللہ تعالیٰ نے جو راہِ راست (بصیرتِ حق) تمہیں دکھائی اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

اسی طرح اجماع کے بارے میں بھی اُن کا یہی خیال ہے کہ اس کا ماخذِ شریعت ہونا بھی از روئے نصِ قرآن ثابت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔ — اور جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہلِ ایمان کے راستے کے سوا کسی اور راستہ پر چلے، درآنحالیکہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہے تو اس کو ہم اُسی طرف چلائیں کے جدھر وہ خود پھر گیا اور اُسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔

اس آیت میں سبیل المومنین (یعنی جماعت کا متفقہ راستہ) ہونا کے اتباع کو بھی لازم قرار دیا گیا ہے۔ مذکورہ مآخذ کے علاوہ قرآن عُرف (تعامل اور رواجِ عام) کو بھی قانون کا ماخذ تسلیم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کو حکم دیا ہے: وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو)۔ معروف میں وہ تمام رواج بھی شامل ہیں جو کسی معاشرے میں عادۃً جانے پہچانے ہوتے ہیں

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ فقہاء نے اصولِ اربعہ (کتاب اللہ، سنتِ رسول، اجماعِ امت اور اجتہاد) کے ساتھ ساتھ عُرف کو پانچواں مستقل سرچشمۂ قانون (اصلِ خامس) کیوں نہیں ٹھہرایا ہے۔ اور جب عرف کو ماخذِ حکم تسلیم کیا جاتا ہے تو اس کی کیا شرائط ہیں؟ پہلے جزو کا جواب یہ ہے کہ فقہاء نے عرف کو مستقل اور جداگانہ طور پر اصلِ خامس اس لیے قرار نہیں دیا کہ عرف دراصل انہیں مصالح سے عبارت ہوتا ہے جو معاشرے میں معتبر و مسلَّم ہوتے ہیں۔ اور شریعتِ اسلامی کی اساس و بنیاد پہلے ہی سے ان مصالح کی رعایت پر استوار ہے۔ دوسرے لفظوں میں عُرف و عادت کا لحاظ و اعتبار شرعاً ناگزیر ہے جس کی شہادت خود اصولِ اربعہ میں موجود ہے۔ اگر شریعت نے اپنے احکام و قواعد کے نفاذ میں معاشرتی عادات و روایات کی مراعات نہ کی ہوتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ انسانی مصالح معطل ہو جاتے اور شریعت انسانوں پر ایسی تکالیف کا بار لاد دیتی جو ان کی استطاعت اور قدرت سے باہر ہوتا۔ یہ بات نہ صرف شریعت کی حکمت کے خلاف اور ناجائز ہے بلکہ واقعۃً شریعت اس سے بری اور منزہ ہے۔ چنانچہ عُرف اہمیت و اعتبار کی بنا پر شریعت کی فرع اور اصولِ اربعہ کی قدرِ مشترک ہے۔ اس لیے یہ الگ اور مستقل سرچشمۂ قانون نہیں قرار پایا۔ دوسرے جزو کا جواب یہ ہے کہ تشریع و تقنین کے باب میں آئندہ عرف کو کسی حکم کا مدار و مبنیٰ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ٹکراؤ کسی حکمِ قطعی سے نہ ہوتا ہو یا اس کے اختیار کرنے سے کسی شرعی قاعدے کی نفی نہ لازم آتی ہو۔ مثلاً حرمتِ ربا کا حکم ہے۔ اسلام سے قبل معاشرۂ عرب میں ربا کا لین دین جاری تھا لیکن شریعت کے قطعی حکمِ تحریم کے مقابلے میں اسے منسوخ قرار دے دیا گیا (کیونکہ مصلحتِ انسانی کا یہی تقاضا تھا)۔ اسی طرح پھلوں کے آنے سے قبل ہی درختوں کی بیع کا رواج تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع کو ممنوع قرار دے دیا کیونکہ اس کی زد اس قاعدہ پر پڑتی تھی کہ "باطل طریقے سے لوگوں کے مال کھانا جائز نہیں ہے"۔ یہ قاعدہ دراصل قرآن کے اس حکم پر مبنی ہے کہ "لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ" (تم آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ) اس عُرفی بیع کو منسوخ کر دیا کیونکہ بیع کی یہ صورت بھی باطل طریقے کی تعریف میں آتی ہے۔

سنّتِ رسولؐ

سنت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم سنت کا لفظ سَنّ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں بَیَّنَ (بیان کرنا) سنّتِ رسول کو اس لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ مناسبت یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کی مُبَیّن ہے یعنی اس کی تشریح و توضیح کرتی ہے۔

علم الاصول کی اصطلاح میں سنّت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول و فعل و تقریر ہے جو قرآنی آیات و احکام کے ماسوا آپ سے صادر ہوا ہے۔ اس تعریف کی رو سے سنت کی تین قسمیں ہیں (۱) اقوالِ رسول (۲) افعالِ رسول، اتباع اور امتثالِ امر کے باب میں قول کی بہ نسبت فعل زیادہ تاثیر اور صراحت رکھتا ہے (۳) تقریرات۔ اس سے مراد وہ کام ہیں جو آپ کے سامنے کیے گئے یا آپ کے علم میں لائے گئے اور آپ نے کرنے والوں کو منع نہیں فرمایا بلکہ تحسین و تائید یا سکوت اختیار کرنے سے ان کی تثبیت کردی۔

سنت کا تعلق قرآن کے ساتھ اُمتِ مسلمہ فرمانِ خداوندی کے بموجب سنّتِ رسول کے اتباع و اطاعت کی مکلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ اسی حکمِ الٰہی کے تحت شریعتِ اسلامی نے ترتیب و اہمیت کے لحاظ سے اسے آیاتِ الٰہی کے بعد کا درجہ دیا ہے۔

مجموعی طور پر سنت کتاب اللہ ہی کے تابع ہے اور اسی کے مدعا و مقصود کی نمائندگی کرتی ہے کیونکہ سنت مجموعی طور پر تین صورتوں میں سے ایک ہی صورت کے تحت ہوتی ہے۔

۱۔ یا وہ کسی اصلِ قرآنی پر تفریع ہوتی ہے جیسے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے درختوں پر پھل کے آنے سے قبل ان کی بیع و فروخت کو ممنوع ٹھہرایا اور آپ کا یہ حکم قرآن کی اس اصل پر مبنی ہے کہ لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ۔

۲۔ یا وہ کسی عام قاعدے کی تشریح اور کسی اجمال کی تفصیل ہوتی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا حکم ہے "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" یہ ایک مجمل اور عام حکم ہے۔ اس کی عملی تفصیلات و ہدایات سنّت میں وارد ہیں۔ اسی طرح یہ ارشادِ خداوندی کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ بِھَا وَتُزَکِّیْھِمْ (اے نبی! ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ ہم ایک مجمل حکم ہے جو تفصیلات و توضیحات کا محتاج ہے۔ چنانچہ صدقہ کی وصولی اور تطہیر و تزکیہ کی جملہ تفصیلات سنت مہیا کرتی ہے۔ ۳